غزل۔ معنی، مفہوم اور مزاج

Ghazal-Meaning, Comprehension and Substance

ڈاکٹر قندیل بدر*

Abstract:

Ghazal is the most popular poetic genre of Eastern Literature. Its creative passage of a thousand years has enlightened its concept and intellect specifically its multi-dimensional rigidity. In this paper, efforts have been made towards gathering most of the intellectual studies carried out on the word "Ghazal". Further, efforts have also been made towards comprehension of individuality of Ghazal in the light of these intellectual studied.

Key Words: Ghazal, Arabic Culture, Meaning and term, Persian Substance.

غزل عربی زبان کا لفظ ہے۔ لسانیات کے ماہرین اس بات پر پوری طرح متفق نظر آتے ہیں کہ لفظ کے معنوی امکانات کو بروئے کار لانے کے اعتبار سے جن زبانوں کو غیر معمولی اہمیت حاصل رہی ہے، عربی ان میں سے ایک نمائندہ زبان ہے۔ عربی کا کوئی بھی لفظ ہو اسے اکہرے معنی میں قبول کرنا عربی زبان کی روح سے عدم واقفیت ظاہر کرتا ہے۔ غزل کے بارے میں ہونے والی تحقیق سے اتنا تو ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لفظ عرب تہذیب میں خاصی قدامت رکھتا ہے۔ قرآن و حدیث میں اس لفظ کی موجودگی اس کے معنوی امکانات کے ساتھ اسے تقدس سے برتے جانے کا تناظر بھی مہیا کرتے ہیں۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ اس لفظ کے ساتھ جن معانی کو جوڑا گیا ہے وہ ایک دوسرے سے کوئی معنوی قربت نہیں رکھتے۔ یہ بات بہ ذات خود عربی زبان کی وسعت کا بھی اظہار ہے اور اس ثقافتی بوقلمونی کو بھی ظاہر کرتی ہے جو اس زبان کے استعمال کرنے والے جغرافیائی خطے میں موجود رہی ہے۔ یہاں یہ بات بھی قابل غور ہے کہ دنیا کے دیگر خطوں کی طرح عرب بھی وسیع پیمانے پر تغیر و تبدل سے دوچار رہا ہے، موجودہ زمانے میں عربی زبان اور ثقافت کا مطالعہ غزل کی ان تمام معنوی وسعتوں کو نہیں سمیٹ سکتا جو اس لفظ کے آغاز

* Assistant Professor / HOD, Urdu Department, Sardar Bahadur Khan Women University, Quetta

استعمال کے وقت رائج رہے اور جن میں وقت کے ساتھ ثقافتی تناظر اضافے کرتا رہا۔ تاہم اتنا ضرور ہے کہ دست یاب تاریخی علم کے ذریعے اس لفظ کی معنوی جہات کو گرفت میں لینے کی بھرپور سعی کی گئی ہے۔ اس سعی کو قابل تحسین اس اعتبار سے بھی قرار دیا جا سکتا ہے کہ اس طرح غزل کے لغوی معنی اس کے ان اصطلاحی مفاہیم سے زیادہ وسیع اور کثیر الجہت ہو گئے جو زمانہ حال تک غزل کی تمام تخلیقی وسعتوں کے باوجود رائج و مقبول رہے۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ لغوی معنی کی کثیر الجہتی کے باوجود بھی اس کے اصطلاحی مفہوم پر تاحال غور و خوض نہیں ہو سکا۔ اس تناظر میں غزل کے لغوی معنوں پر ایک نظر ڈالنا ضروری ہے۔

ہمارے ہاں لفظ "غزل" کو زیادہ تر اس کے روایتی معنوں تک محدود رکھا گیا۔ یعنی حسن و عشق کے قصے، عورتوں سے باتیں یا عورتوں کی باتیں ہی غزل کے لغوی معنی ٹھہرائے گئے۔ اردو لغت (تاریخی اصول پر) میں غزل کے متعلق لکھا ہے:

"لغوی معنی عورتوں کے ساتھ بات چیت اور عشق بازی۔"(1).

جب کہ "فرہنگ آصفیہ" میں غزل کے معنی یوں درج ہیں:

"معشوق یا اپنے محبوب کے ساتھ کھیلنا۔ عورتوں کے ساتھ بات چیت۔ جوانی اور ہم صحبتی کا ذکر۔ عورتوں کے عشق کا ذکر"(2).

حالاں کہ عربی میں لفظ "غزل"، اس سے جڑے مرکبات و مشتقات حتیٰ کہ مترادفات کی بھی طویل فہرست موجود رہی ہے۔ جس کا مختصر تذکرہ حسب ذیل ہے۔ یہاں یہ لکھنا ازبس ضروری ہے کہ سعد اللہ کلیم نے اپنی کتاب "اردو غزل کی تہذیبی و فکری بنیادیں" میں لفظ "غزل" کی فکری و معنوی جہات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ لفظ "غزل" کے سلسلے میں درج ذیل معلومات زیادہ تر اسی کتاب سے استفادے پر مبنی ہیں۔

لفظ "غزل" جب 'ز' اور 'ل' کے سکون کے ساتھ بولا جائے تو اس کے معنی "سوت کاتنے" کے ہیں۔ قرآن پاک کی "سورۃ النحل" کی آیت نمبر ۹۲ میں یہ لفظ انھی معنوں میں درج ہوا ہے۔ اور جب غزل 'غ' اور 'ز' بالفتح کی صورت میں بولا جائے تو اس کے معنی 'گانے' کے ہیں۔ حدیث میں یہ لفظ انھی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "انصار ایک ایسی قوم ہے جس میں غزل (یعنی گانے) کا بہت رواج ہے۔ لفظ "غزل" سے مراد وہ گیت بھی لیے جاتے رہے ہیں، جو

عورتیں سوت کاتتے ہوئے گاتی ہیں۔اس کے ساتھ ساتھ عربی میں غزل بہ یک وقت سوت کاتنے، سوت کاتنے والی یا والا، سوت کاتنے والے تکلے، تکلے کے گھومنے (یا طواف کرنے)، حتیٰ کہ کاتی جانے والی شے (دھاگہ، ڈور) کے معنوں میں بھی مستعمل رہا ہے۔

لفظ ''غزل'' سے بنائے گئے کئی مرکبات بھی بہت معروف بتائے جاتے ہیں جیسے 'الغزل' مذکر اور مکڑی کا جالہ کے معنی میں، 'غزل فی الجبل' پہاڑی مکڑی کا جالہ، 'رجل غزل' وہ آدمی جو عورتوں سے پیار محبت کی باتیں کرے اور خاندانی افتخار کا اظہار کرے، 'یغزل اعتزل' عورت سے عاشقانہ اور رجھانے والی گفتگو کرنا یا پیش آنا، 'غزل و تغزل' عاشقانہ بات چیت یا شاعری، 'غزل النساء' ایک پھول کا نام اور اس کے علاوہ اس سے مراد وہ گھبراہٹ بھی ہے جو کتا غزال کے تعاقب میں محسوس کرتا ہے اور 'غزل الکلب غزالاً' کتے کا ہرن کو پا کر اس سے پیچھے ہٹ جانے کے معنی میں مستعمل رہا ہے۔

غزل سے کئی مشتقات بھی ماخوذ ہیں جن میں 'مغازلہ' سے مراد عورت و مرد کی باہم گفتگو ،'تغزل' سے مراد عورت سے کیا گیا مرد کا اظہار محبت، جب کہ 'غزال' نو عمر ہرن (ہرنوٹے) کے لیے مستعمل رہا ہے۔اسی طرح 'غزالہ' مطلق سورج یا سورج کی ٹکیہ کے علاوہ چاشت کے وقت کو بھی کہتے ہیں ۔اس کے ساتھ ساتھ 'غزالہ' ایک خودرو جنگلی بوٹی کو بھی کہتے ہیں جو میٹھی ہوتی ہے۔'دم الغزال' ایک سبزی ہے جس کی جڑیں سرخ ہوتی ہیں اور پانی خوشبودار اور سرخ ہوتا ہے۔جب کہ 'طلعت الغزالہ' سے مراد سورج کا طلوع ہونا ہے۔لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ 'غربت الغزالہ' کا مرکب مستعمل نہیں گویا 'غزالہ' صرف سورج کے طلوع کرتے روپ کے لیے بولا جاتا ہے ۔اس کے علاوہ 'غزالتہ الشمس' کی ترکیب سورج کے خاصے بلند آ جانے کے لیے بولی جاتی ہے۔

اس کے علاوہ عربی میں غزل کے کئی مترادفات بھی معروف رہے ہیں۔'لہو' انہی میں سے ایک ہے۔احادیث میں لفظ 'غزل' کے استعمال کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ احادیث کی کچھ کتب میں جہاں لفظ 'غزل' استعمال ہوا ہے، وہیں احادیث کی دیگر کتب 'لہو' کا لفظ استعمال کرتی ہیں ۔'لہو' کے بنیادی معنی کھیل تماشے سے حاصل ہونے والے حظ و نشاط کے ہیں۔ڈاکٹر وقار احمد رضوی غزل کے ایک اور مترادف پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اس (غزل) کے لیے ایک دوسرا لفظ تشاج بھی ہے۔ تشاج متفاعل کے وزن پر ہے اور ”شجی“ سے مشتق ہے۔ شجی، غمگین کو کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ شخص ان لوگوں سے مشابہ ہے جن کو محبت کی چوٹ لگ چکی ہے کیوں کہ لغت میں عشق کا مارا ہوا یا مریض عشق کو بھی تشاج کہتے ہیں"(3).

اسی طرح لفظ 'تشبیب' اور 'نسیب' بھی غزل کے مترادفات کے طور پر مستعمل رہے ہیں۔ 'تشبیب' کی مناسبت سے محبت، شباب اور موسیقی، جب کہ 'نسیب' کے حوالے سے محبوب کی یاد، ہجر کا دکھ حتیٰ کہ شتربانوں کے حزنیہ گیتوں کے مفاہیم بھی غزل کے معنوی دوائر میں داخل رہے ہیں۔

لفظ ”غزل“ کے گرد موجود یہ لسانی جال ظاہر کرتا ہے کہ یہ لفظ ثقافتی تناظر سے اپنے معنی کشید کرتا رہا ہے اور اس کے معنی کا اختلاف یہ ظاہر کرتا ہے کہ معنی کی سطح پر اس کی طرفین محدود نہیں ہیں۔ سوت کاتنا، گیت، سورج اور ہرنوٹے سے اس لفظ کی معنوی و تلازماتی قربت اس کا بین ثبوت ہے۔ یہاں دلچسپ بات یہ ہے کہ غزل کا لفظ طلوع کے لیے تو مروج رہا مگر غروب کے لیے اسے استعمال نہ کیا گیا۔ اس بات میں ان ناقدین کے لیے بلیغ اشارہ موجود ہے جو وقتاً فوقتاً غزل کی موت کے اعلانات کرتے رہے ہیں۔ تاہم غزل کی بہ صورت تشبیب، قصیدہ کے جزو کی حیثیت میں اور ایک الگ صنف کے طور پر اس کے اصطلاحی مفہوم کی پیش کش میں، اس کا تمام لغوی تناظر مد نظر نہیں رہا۔ تخلیقی طور پر اس صنف کا مطالعہ یقیناً اس کی وسعتوں کو اصطلاحی مفہوم کے محدود محیط سے وسیع ثابت کرتا ہے۔ تاہم اس وسعت کی تمام جہتوں کو لغوی مفاہیم سے ہم آہنگ کرنا ممکن نہیں کیوں کہ بہ طور اصطلاح اس کے رائج ہونے میں بہت سے معنی جو روزمرہ کی صورت میں مقبول تھے، نظر انداز کر دیے گئے۔ غزل کے بارے میں ابتدائی طور پر جو محدود لغوی معنی تذکروں میں موجود ہیں وہ اس بات کی طرف متوجہ کرتے ہیں کہ غزل کی تخلیقی صورت ان لغوی معانی کے علاوہ لفظ کی دیگر معنوی جہتوں سے ارتباط نہیں رکھتی اور آج غزل کے لغوی معانی میں جو وسعت پیدا کرنے کی تحقیقی کاوشیں ہوئی ہیں، اس کا تناظر یقیناغزل کی تخلیقی وسعت پذیری نے فراہم کیا ہے۔ تاہم یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عرب معاشرت میں موجود غزل کی ابتدائی صورتیں آج کی تخلیقی غزل سے پوری طرح ہم آہنگ ہیں۔ ان معنی کا حصول صرف اس بات کی تصدیق

کے لیے ضروری تھا کہ غزل تنگ نائے نہیں ہے بل کہ ہر زمانی تغیر کے ساتھ دینے کی استعداد لفظ ''غزل'' میں روزِ اول سے موجود رہی ہے۔ جسے سست رفتار تہذیبی ادوار نظر انداز کرتے رہے ہیں۔

غزل اپنے اصطلاحی مفہوم میں ایک مکمل صنف سخن ہے جو اپنے مخصوص ظاہر و باطن کی بنیاد پر دوسری اصناف سے الگ پہچانی جاسکتی ہے۔ طارق ہاشمی لکھتے ہیں:

"ہیئت کے لحاظ سے غزل متحد الوزن اور متحد القوافی مگر مختلف الموضوع ابیات کا ایک سلسلہ ہوتا ہے ۔۔۔ غزل کی ساخت اپنے باطن میں ایک زبردست جمہوری نظام رکھتی ہے کہ صنف غزل اشعار کو ایک مخصوص وزن کا پابند تو بناتی ہے ، قوافی کے لحاظ سے بھی کوئی زیادہ رعایت نہیں دیتی، نیز ردیف ہونے کی صورت میں اس کی تکرار میں بھی کسی نوع کی کوتاہی برداشت نہیں کرتی، مصرعوں کی پیمائش بھی ملحوظ رکھتی ہے لیکن جہاں تک فکر و خیال کا تعلق ہے غزل اپنے شعروں کو مکمل آزادی اظہار دیتی ہے"(4).

غزل کے اصطلاحی مفہوم میں اس کے موضوع کے برعکس اس کی ہیئت کی اہمیت زیادہ بنتی ہے۔ غزل تسلسل کے ساتھ دوچار موضوعات کو برتتی ضرور رہی ہے مگر ایسا نہیں کہ یہ موضوعات دیگر اصناف سخن کے لیے شجر ممنوعہ رہے ہوں اس لیے غزل کے اصطلاحی مفہوم تک رسائی اسی صورت میں درست ہو سکتی ہے، جب موضوعاتی مماثلت کے برعکس اس کی ہیئت کو پیش نظر اور مقدم رکھا جائے ۔ شمیم احمد رقم طراز ہیں:

"غزل اردو کی مقبول ترین صنف ہے۔ اس کی صنفی شناخت کا دار و مدار اس کی مخصوص ہیئت پر ہے۔ اس صنف میں موضوع کو اہمیت حاصل نہیں"(5).

غزل کی اصطلاح کا تحقیقی مطالعہ اسے قصیدے کی تشبیب و نسیب کے علاوہ فارسی کے لوک گیتوں (چامہ) سے جوڑتا رہا ہے۔ 'چامہ' ایک قدیم ایرانی صنف ہے جو عورتوں سے منسوب ہے ۔ یہ بہ یک وقت شاعری اور موسیقی تھی اور اپنے خصائص کے اعتبار سے غزل سے قریب کی چیز ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا اس بارے میں لکھتے ہیں:

"چوں کہ غزل مزاجاً گیت کی اساس پر استوار ہے اس لیے غزل کو عربی قصیدہ کی تشبیب کے بہ جائے ایرانی 'چامہ' سے منسلک کرنا زیادہ قرین قیاس ہے"(6).

یہاں حدیث میں درج غزل کے ان معنی کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جس کے مطابق غزل کے معنی 'گیت' کے ہیں۔ گیت سے غزل کی مزاجی قربت عرب میں اس لفظ کے لغوی مفاہیم ہی سے ظاہر ہو جاتی ہے۔ جس کا اعزاز سراسر ایرانی "چامہ" کو نہیں دیا جا سکتا۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ غزل کو بہ طور صنف معروف کرنے کا سہرا اہل فارس کے سر ہے۔ اس صنف پر مزید بحث سے قبل یہ بتانا ضروری ہے کہ عربی کے برعکس فارسی میں لفظ "غزل" بہ طور اصطلاح کے مروج رہا ہے اور اس کا استعمال بہ جائے صنف شعری کے بہ طور اصطلاح موسیقی ہوا ہے۔ طارق ہاشمی لکھتے ہیں:

"غزل کی دوسری حیثیت اصطلاحی ہے۔ مگر اس کا تعلق شاعری کے بہ جائے موسیقی سے ہے۔ "قول و غزل" موسیقی کی معروف اصطلاحیں ہیں۔ غزل کا بہ طور اصطلاح موسیقی اولین سراغ قدیم ساسانی دور میں خسرو پرویز کے درباری گائیک باربد کے حوالہ سے ملتا ہے، جس نے ۳۶۰ راگنیاں ایجاد کیں، جن میں سے ایک کا نام غزل تھا"(7).

اس کے علاوہ امیر خسرو نے بھی اپنی ایجاد کردہ راگنیوں میں سے ایک کو غزل سے منسوب کیا تھا۔ بہ اصطلاح موسیقی غزل کے حوالے سے طارق ہاشمی ایک اہم حوالہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ "بائبل" کی ایک کتاب "Songs of songs" جو حضرت سلیمانؑ سے منسوب بعض عشقیہ مکالموں پر مشتمل ہے، جس کے اردو ترجمہ کو "غزل الغزلات" کا عنوان گیا ہے۔

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ غزل کی صنف کو ایک تخلیقی اظہار کی صورت دینے میں اہل فارس کا کردار غیر معمولی رہا ہے۔ اور اس میں بھی کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ یہ اسی وقت ممکن تھا جب غزل کے مزاج کی کوئی خام صورت ان کی اپنی زمینی مہک میں موجود ہوتی۔ اس لیے غزل کے پس منظر میں ان لوک گیتوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جس نے اسے صوتی اور حسیاتی رنگ عطا کیے تاہم جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ غزل کی ہیئت کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کے اصطلاحی مفہوم تک رسائی ناممکن ہے۔ جب کہ یہ بات یقینی ہے کہ غزل کی ہیئت قصیدے کی تشبیب سے مستعار ہے۔ ہمارے اکثر ناقدین و محققین اس بات پر متفق ہیں کہ غزل کا جنم قصیدے کے ابتدائی عنصر تشبیب سے ہوا جس میں عموماً عشقیہ اشعار لکھنے کا رواج تھا۔ تشبیب غزل کے اصطلاحی مفہوم کا ماخذ ہے کیوں کہ غزل کی ہیئت اس ماخذ سے دست بردار

نہیں ہو سکتی۔ جہاں تک غزل کے اصطلاحی مفہوم میں فارسی گیتوں کے اثر کا تعلق ہے تو اس ضمن میں سعد اللہ کلیم کی یہ رائے خاص توجہ چاہتی ہے:

"غزل کا لفظ تو عربی الاصل ہے ہی ،صنف شعر کے طور پر بھی غزل کا بنیادی رشتہ عربی قصیدے سے مسلم ہے۔ فارسی لوک گیتوں سے غزل کا رشتہ اس لیے مشکوک ٹھہرتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد سے پہلے کی فارسی شاعری کا کوئی دستاویزی ثبوت فی الوقت موجود نہیں۔ مزید یہ کہ جسے ہم فارسی شاعری کہتے ہیں ،اس کا وجود ہی عربی اوزان اوراصناف اختیار کرنے کا نتیجہ ہے گویا عربی شاعری سے اثرات قبول کرنے کے نتیجے میں خود فارسی شاعری اور فارسی غزل وجود میں آئی "(8).

غزل بہ طور صنف موضوع سے زیادہ ہیئت پر انحصار رکھتی ہے اور اس کی ہیئت میں اہم ترین جزو کی حیثیت قافیے کو حاصل ہے قافیہ عربی شعریات کا جزو اعظم ہے اس لیے غزل کے اصطلاحی مفہوم کو عربی ہی سے اخذ شدہ تسلیم کیا جانا چاہیے۔ بہ قول حمید احمد خان:

" قافیے کو غزل میں جو فوقیت ملی وہ عرب کا ترکہ ہے۔ عربی میں قافیہ شعر کا جزوِ لاینفک ہے ۔ یہاں تک کہ قافیہ بلا وزن شعر ہے۔ لیکن وزن بلا قافیہ نثر ہے، شعر نہیں ہے(9).

اس کے باوجود کہ قافیہ وردیف کی کچھ صورتیں قدیم فارسی ادب میں بھی موجود رہی ہیں تاہم انہیں عربی ادب ہی کا اثر ہے۔ غزل کی صنف کو مجموعی طور پر پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ فارسیت کے غلبے کے باوجود اس صنف کی ابتدائی نگہداشت اہل عرب ہی کے ہاتھوں ہوئی۔ غزل کے محبوب کی غزال سے مناسبت ،عربی زبان میں غزل کے لفظ کا عورتوں سے متعلق ہونے کا تصور نیز تشبیب کی صورت میں غزل کی ہیئت کا مکمل احساس وہ پہلو ہیں جنہیں فارسی غزل نے بھی تمام ارتقائی مراحل میں تسلسل سے برتا ہے۔ غزل کو بہ طور صنف جن ابتدائی نقوش کی ضرورت تھی وہ یقیناً اسے اہل عرب نے عطا کر دیے تھے۔ اس لیے اس کے اصطلاحی مفہوم کا سفر عربی ادب ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ اس صنف نے بعد میں اپنے مفہوم کی معنویت میں ارتقا کو قبول نہیں کیا۔ تاہم اس ارتقا کی نوعیت اساس میں تبدیلی سے زیادہ اساس پر قائم ساخت میں تبدیلی سے مطابقت رکھتی ہے۔

غزل کی بنیاد پر غور کیا جائے تو بعض حوالے بہ طور خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ غزل کا عورتوں سے باتیں یا

عورتوں کی باتیں سمجھے جانے کا تصور آج بھی بڑی حد تک مقبول ہے۔ جس کے پس منظر میں اس لفظ کے ان لغوی معنوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا، جس میں عورتوں سے اس کا تعلق صاف ظاہر ہوتا ہے۔ سوت کاتتے ہوئے عورتوں کے گائے جانے والے گیت کو بھی عرب معاشرت میں غزل کہا گیا ہے جو اس آہنگ سے متعلق تصور کی ابتدائی صورت کہلائی جا سکتی ہے۔ عورتوں سے بات کرتے ہوئے ادب آداب، تہذیب و شرافت، نرمی و شائستگی کے جن اوصاف کو ضروری خیال کیا جاتا ہے، وہ غزل کے تخلیقی رویے میں عیاں طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ عورتوں کی گفتگو کی ایمائیت کو غزل کی صنف میں ہمیشہ سے ایک اہم مقام دیا گیا ہے۔ نیز غزل کا محبوب اپنے حسن میں اور اپنے رویے میں اردو غزل تک، غزال سے مماثلتی اوصاف کا حامل رہا ہے۔

ہیئت کی سطح پر تشبیب کے ہر شعر کی طرح ایک مکمل اکائی اور ماسبق و مابعد اشعار سے موضوعاتی عدم تعلق کے باوجود ایک موسیقانہ ربط غزل کو آج بھی تشبیب سے مکمل طور پر بے نیاز نہیں ہونے دیتا۔ غزل کا کوئی بھی اصطلاحی مفہوم ہو اس میں ان باتوں کا نظر انداز نہ کیا جانا، یہ ظاہر کرتا ہے کہ غزل نے اپنے اصطلاحی مفہوم کی بنیاد عرب میں رکھی۔ صنف شعر کے طور پر غزل کو قصیدے سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا، نہ ہی ان مفاہیم کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے جو بہ طور صنف غزل کو عرب تہذیب و معاشرت کی دین ہیں۔ لیکن یہ بھی غلط نہیں کہ غزل کی صنفی بلوغت اہل فارس کے ہاں ہوئی اور اہل فارس نے غزل کو موضوعاتی سطح پر ایک مخصوص مزاج دینے میں زیادہ اہم کردار ادا کیا۔ غزل کے بنیادی موضوعات بڑی حد تک فارس کی معاشرت و مزاج کی دین ہیں جن میں تبدیلی جغرافیائی تبدیلی کے باوجود روا نہ رکھی گئی اور اس تخلیقی کوتاہی کو غزل کی بنیاد سے شناسائی قرار دیا گیا، جس نے طویل عرصے تک غزل کو تخلیقی توانائی سے محروم رکھا۔ غزل پر جو اعتراضات ہوئے، وہ بڑی حد تک فرسودہ مضامین اور غیر معروضی موضوعات و تجربات سے اس کی دل بستگی سے متعلق ہیں۔ جس کے لیے قصوروار غزل سے زیادہ غزل کی صنف کو برتنے والے تخلیق کار ٹھہرتے ہیں جنھوں نے غزل کے اصطلاحی مفہوم میں اہل فارس کے عطا کردہ موضوعاتی مزاج کو بھی شامل سمجھا۔ نتیجتاً ایک زندہ صنف ہونے کے باوجود موضوعاتی تکرار نے ایک طویل عرصے تک اسے پوری تخلیقی زندگی سے محروم رکھا۔ اہل بلوچستان اس اعتبار سے قابل ذکر ہیں کہ انھوں نے بہت جلد غزل کو اپنی مٹی کی بوباس عطا کرنا شروع کر دیا تھا، اس لیے یہاں کی غزل، غزل کے اصطلاحی مفہوم پر پورا اترنے کے ساتھ اس کے مزاج کو بھی درست انداز میں سمجھنے میں پوری

طرح کام یاب رہی ہے۔ در حقیقت ضرورت بھی اس امر کی تھی کہ لغوی اور اصطلاحی مفاہیم میں الجھنے کے بر عکس بہ طور صنف غزل کے مزاج کو سمجھا اور طے کیا جاتا، مگر اس المیے کا کیا جائے کہ اردو ادب میں اصطلاحی مفہوم ہی کو مزاج سمجھا گیا ہے۔ غزل کے مزاج کو سمجھنے کی قابل ذکر کاوشیں قیام پاکستان کے بعد ہی منظر عام پر آ سکیں ہیں۔ اس لیے یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ غزل کی سمجھ بوجھ کا سفر صحیح معنوں میں اب شروع ہوا ہے۔

غزل کے مزاج کو سمجھنے کی کوششیں زیادہ قدیم نہیں کیوں کہ اصناف کا مطالعہ یہی ظاہر کرتا ہے کہ ان کے سلسلے میں لغوی اور اصطلاحی مفاہیم ہی کو قابل تشفی سمجھ لیا گیا۔ غزل کے سلسلے میں بھی صورت حال کوئی زیادہ مختلف نہیں۔ غزل کے مزاج کو سمجھنے کی جو کوششیں ہوئی ہیں ان میں بعض محققین وناقدین نے اس کے لغوی و اصطلاحی مفاہیم کو پیش نظر رکھا ہے، جب کہ بعض نے انہیں نظر انداز کرتے ہوئے اس کے مزاج کو طے کیا ہے۔ ایک سوال جو اس پورے تناظر میں نظر انداز کیا گیا، وہ یہ ہے کہ کیا صنف کسی مخصوص مزاج کے ساتھ پیدا ہوتی ہے یا اس کا مزاج صنف کے تخلیقی عمل کا ارتقا طے کرتا ہے ۔اگر پہلی بات کو درست سمجھا جائے تو صنف کے مزاج کو طے کرنے کے عوامل اس ثقافت و تہذیب سے مربوط دکھائی دیں گے جس میں کسی صنف کا جنم ہوا ہے، جب کہ دوسری صورت میں انفرادی مزاج صنف کے مزاج کو طے کرنے میں غالب عنصر کا حامل ہو گا۔ غزل کے مزاج کو سمجھنے میں نہ تو پہلے رخ کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ دوسرے رخ کو۔ لیکن غزل یقیناً بعض اساسی اوصاف کے ساتھ منصہ شہود پر آئی جسے تہذیبی تناظر سے الگ کرنا درست نہیں ہو گا۔ ڈاکٹر ضیا الحسن کے بہ قول:

"جس طرح ایرانی تہذیب میں عرب تہذیب شامل تھی، اسی طرح ہندوستانی تہذیب بھی کئی تہذیبوں کے ہزاروں سالہ ملاپ کا نتیجہ تھی اور اپنے اندر متعدد تہذیبوں کی خوشبو لیے ہوئی تھی۔ اس پیچیدہ ترکیب میں ہر تہذیب اپنی طاقت کے ساتھ الگ وجود رکھتے ہوئے نئی تہذیب کا حصہ بنی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ غزل کے مزاج میں آغاز سے وسیع المشربی اور انجذاب کی قوتیں شامل ہو گئیں۔ غزل اپنی موضوعاتی اور اسلوبیاتی ساخت ہی میں وسیع المشرب نہیں ہے بل کہ اپنی ہیئت میں بھی یہی آزادگی اور فراخی لیے ہوئے ہے"(10).

تاہم یہ نکتہ بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ بہت سے اوصاف اس نے اپنے تخلیقی ارتقا کے

ذریعے بھی حاصل کیے۔ البتہ مزاج کی اساس میں ان عناصر کی اہمیت یقیناً زیادہ بنتی ہے جو زمانی تغیر کے مقابل اپنی وجودی اہمیت ثابت کر پائے ہیں۔ غزل اپنے مزاج میں اپنے لغوی و اصطلاحی مفاہیم سے آزاد نہیں ہو سکی اور اگر لغوی اور اصطلاحی مفاہیم کا ہی کماحقہ جائزہ لیا جائے تو مزاج بڑی حد تک طے کیا جا سکتا ہے۔ غزل کے مزاج میں اس کے جن لغوی مفاہیم نے خاص کردار ادا کیا ہے ان میں عورت سے گفتگو اور غزال کی شکار ہونے کے عمل کے دوران کی کیفیات کا خاص عمل دخل رہا ہے۔ عرب معاشرت سے پاکستانی معاشرت تک عورتوں سے گفتگو ایک خاص نوع کے ادب آداب کی حامل رہی ہے ان ادب آداب کی تفہیم کے بغیر غزل کے مزاج کو صورت دینے والے اوصاف نمایاں نہیں ہو سکتے۔ عورت سے گفتگو چاہے اس کے متعلق ہو یا اس سے غیر متعلق، چاہے اس کی مدح و سرا سے جڑی ہوئی ہو یا معاملات حیات سے، چاہے پاکیزہ جذبات کے اظہار کے لیے ہو یا جنسی خواہشات کے زیر اثر، مکمل وضاحت پر مبنی نہیں ہوتی۔ بالخصوص ہمارے تہذیبی سفر نے مرد و عورت کے مابین مفصل مکالمے کو راہ نہیں دی جس کی وجہ معاشرتی نظام میں مرد کی مرکزیت کو بھی قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس گفتگو میں متکلم کی حیثیت عورت کے برعکس، مرد کی زیادہ رہی ہے، مفصل گفتگو نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ دونوں کے مابین کوئی ایسا مکالمہ راہ نہیں پا سکتا جو تفصیل طلب ہو، تاہم اس گفتگو کی خاص بات یہی ہے کہ اس میں تفصیل طلب بات کو بھی اختصار سے بیان کرنے کے قرینے کو مد نظر رکھا جاتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا قلم بند کرتے ہیں:

"غزل گو شاعر تفصیل پسندی کے بہ جائے اجمالی نظر کا قائل ہوتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ غزل کے شعر میں بڑی سے بڑی حقیقت اور طویل سے طویل کہانی بھی محض ایک استعارے میں بیان ہو جاتی ہے اور شاعر کم سے کم الفاظ میں اپنے مافی الضمیر کو دوسروں تک پہنچانے کی سعی کرتا ہے"(11).

اشارت و ایمائیت، گفتگو میں دو وجوہات کی بنا پر خاص معنویت رکھتی ہے۔

اول: تفصیل طلب بات پر طویل گفتگو سے اجتناب کے لیے۔

دوم: ان جذبات، احساسات اور خیالات کے اظہار کے لیے جن کا واضح بیان ثقافتی طور پر ناپسندیدہ ہو۔

اس گفتگو میں عورت کا کردار بہ ظاہر مفعول لیکن بہ باطن فاعل دکھائی دیتا ہے۔ یعنی گفتگو میں شامل نہ ہونے کے باوجود وہ اپنی شخصیت کے ذریعے گفتگو کا دائرہ کار ترتیب دینے میں غالب نظر آتی ہے۔ اس شخصیت کی تعمیر پر غور کیا جائے تو یہ بڑی حد تک دوہری نظر آتی ہے جو اپنے سماجی کردار اور اپنی فکر

کے مابین خاص فاصلہ قائم رکھتی ہے۔ اس فاصلے کی وجہ معاشرے میں مرد کی مرکزیت اور اس کے رائج کردہ نظام میں وضاحت اور جرأت سے بات نہ کرپانے کا احساس ہے، جسے خوف سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ یہ خوف یا جھجک آمیز احساس اس سے مخاطب کی گفتگو میں صاف طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے۔ بے ربطی، اشارت، غیر معروضیت، ابہام، مخاطب کے جذباتی و فکری وفور کی شدت کے باوجود دوران گفتگو غالب رہتے ہیں۔ یعنی وہ خوف اور جھجک جو عورت دوران گفتگو محسوس کرتی ہے وہ متکلم میں بھی داخل ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے اور اس تمام فضا کو غیر معیوب بناکر پیش کرنے میں شرم وحیا سے متعلق ثقافتی تصورات معاونت کرتے ہیں۔ مغرب میں غزل کی صنف کیوں نہ پنپ سکی؟ اس کا جواب تو غزل کے لغوی معنی پر غور وخوض ہی سے سامنے آجاتے ہیں۔ یعنی غزل کی صنف کی وہاں عدم دست یابی کی غالب وجہ بہ ہر حال مرد وزن کی گفتگو کے مابین یہ مشرقی شرم وحیا اور خوف و جھجک کی موجودگی ہے، جو اس ثقافتی تناظر میں تقریباً ناپید ہے۔ دوسرے معنی پر غور کیا جائے تو ہرن گفتگو کے دوران عورت کا دوسرا قالب محسوس ہوتی ہے۔ شکار ہونے نہ ہونے کے بیچ ہرن کا خوف اور اس سے بچ نکلنے کی تمام تر استعداد شکار کے وقت بیدار ہوجاتی ہے۔ شکاری اور ہرن کے مابین کی یہ تمام صورت حال مرد وعورت کے مابین گفتگو جیسی معلوم ہوتی ہے شکاری اپنی تمام تر تدابیر اور مقتدر حیثیت کے ساتھ ہرن کو گھیرنے کے لیے براہ راست حملے کی بہ جائے بالواسطہ حملے کی صورتیں پیدا کرتا ہے اور ہرن شکار ہونے نہ ہونے کی دوہری کیفیت میں اپنے بچاؤ کی استعداد کو بروئے کار لاتے ہوئے نکلنے کی سعی کرتی ہے۔ یہ لمحہ اس پورے عمل کو کسی منصوبہ بند فعل کے بہ جائے مبہم فعل میں بدل دیتا ہے جس کا نتیجہ قطعیت پر مبنی نہیں ہوتا۔ یہ صورت حال خوف کے ساتھ ساتھ حزن وملال کی کیفیت کو بھی ظاہر کرتی ہے جس کا اندازہ اس آواز سے لگایا جاسکتا ہے جو ہرن کے منہ سے اس وقت نکلتی ہے جب شکاری اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ لغوی مفاہیم کے اس تناظر کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ غزل کے مزاج پر ہونے والی گفتگو اس معنوی تناظر سے عاری نہیں، البتہ اس کا ذکر عام طور پر نہیں کیا گیا۔

غزل کا اصطلاحی مفہوم، غزل کے مزاج کے تعین میں خاص طور پر معاون رہا ہے۔ جس میں بعض عناصر بالخصوص قابل ذکر ہیں۔

۱۔ ہر شعر کا مقفیٰ ہونا۔

۲۔ ہر شعر کا مکمل اکائی ہونے کے باوجود کل سے مربوط ہونا۔

۳۔ شعر کا دو مصرعوں پر مشتمل ہونا۔
۴۔ مقطع میں شاعر کے تخلص کا استعمال۔

قافیہ کیا ہے؟ اور یہ بنیادی طور پر کس تخلیقی احتیاج کو پورا کرتا ہے، اس کی تفہیم کے بغیر ان اصناف کو صحیح طور پر نہیں سمجھا جاسکتا جن کی ہیئتی شناخت میں قافیہ جزولازم کے طور پر موجود ہے۔ سید عابد علی عابد نے رقم کیا ہے:

" قافیہ غزل میں لحن اور آہنگ پیدا کرتا ہے مصرعوں کی ترتیب ایسی ہوتی ہے کہ ہم دوسرے مصرعے کے آخر میں قافیے کا انتظار کرتے ہیں اور جب قافیہ آتا ہے تو دل کو ایسا ہی انبساط حاصل ہوتا ہے جس طرح موسیقی میں سم کے ٹھیک اپنی جگہ پر آنے سے ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں قافیے میں جو حروف ہوتے ہیں وہ مصرعوں کے الفاظ کا غنائی مزاج متعین کرتے ہیں"(12).

غزل میں قافیے کے حوالے سے تجربات بھی ہوئے، یہاں تک کے غزل کو قافیے سے نجات دلانے کی کوشش بھی کی گئی جس کی ناکامی کی وجہ غزل کے مزاج کے تعین میں قافیے کے کردار سے عدم واقفیت ہے۔ یہاں بھی اگر لغوی مفاہیم کو پیش نظر رکھا جائے تو گفتگو کے دوران متکلم کا کسی خاص تقاضے کو پورا کرنے پر بار بار اصرار اور شکاری کا بار بار اور ناکامی کے باوجود ہرن کا پیچھا، ایک خاص طرح کی تکرار کو ظاہر کرتا ہے۔ غزل کے اصطلاحی مفہوم میں قافیہ اس تکرار کی صوتی اور معنوی صورت پیدا کرتا ہے، اس تکرار کے بغیر غزل کی سالمیت قائم نہیں ہوتی۔ یہی تکرار اس کے ہر شعر کو آزاد حیثیت عطا کرنے کے باوجود کل سے مربوط رکھتی ہے۔ شعر کے دو مصرعے ایک طرف عورت کی دوہری شخصیت کی تجسیم کرتے ہیں تو دوسری طرف موت اور زندگی کے مابین ہرن کی کشمکش کا اظہار بنتے ہیں۔ ان دو مصرعوں میں ثنویت اساس وہ تہذیب بھی اپنا اظہار کرتی ہے جسے برصغیر کی آب و خاک نے جنم دیا ہے۔ شعر کے دو مصرعے اور بہ طور اکائی شعر کی سالمیت وہ عمل ہے جو بہ یک وقت غزل کو بت پرست و بت شکن بناتی ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا تحریر کرتے ہیں: "غزل بت پرستی کی ایک صورت بھی ہے اور بت شکنی کا ایک عمل بھی۔ اس میں جزو کی بے قراری بھی ہے اور کل کا تھپک کر سلا دینے والا ہاتھ بھی۔ غزل میں ان دونوں پہلوؤں کا وجود ضروری ہے۔ جہاں ایسا نہیں ہوتا اور وہ کسی ایک پلڑے کی طرف واضح طور پر جھک جاتی ہے تو اس سے غزل کا مزاج بری طرح متاثر ہوتا ہے"(13).

غزل اپنے دو مصرعوں میں ثنویت کا اثبات کرتی ہے اور انھیں ایک شعر کے قالب میں ڈھال کر ان کی نفی کر دیتی ہے۔ماننے نہ ماننے کی اور جینے نہ جینے کی دوہری کیفیات غزل کی ہیئت میں پوری طرح موجود نظر آتی ہیں، جسے اس کے مزاج میں بھی بنیادی حیثیت حاصل ہے۔اس کیفیت کا نفسیاتی اظہار غزل کے مقطع میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مقطع کی اہمیت نفس فہمی میں اس لیے بھی بڑھ جاتی ہے کہ مقطع شاعر کی ذات سے بہ ذریعہ تخلص منسوب ہو جاتا ہے۔بہ قول ڈاکٹر سلیم اختر:

"غزل کا یہ نفسیاتی مطالعہ مقطع کے بغیر ادھورا رہ جائے گا۔ مقطع اس بنا پر خصوصی نفسیاتی اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ تخلص اسے ایک لحاظ سے ذاتی اور نجی بنا دیتا ہے۔غزل اگر اس کا اپنے شوق سے تعمیر کردہ مکان ہے تو تخلص اس پر نیم پلیٹ لگانے والی بات بن جاتی ہے۔پھر یہ بھی ہے کہ غزل اگرچہ دوسروں کے لیے لکھی جاتی ہے لیکن مقطع بالعموم شاعر اپنے لیے لکھتا ہے"(14).

یہاں تخلص کے استعمال کو پوری طرح نہیں سمجھا گیا کیوں کہ مقطع صرف اظہار ذات کا حامل نہیں ہوتا۔ تخلص متذکرہ دوہری کیفیت کا علامتی اظہار ہے۔غزل اپنی صورت پذیری میں خالق کی مرہون ہے مگر معنی یابی میں اس سے آزاد۔اس لیے مصنف اپنے ذاتی نام کی بہ جائے اپنے علامتی نام کا اظہار کرتا ہے تا کہ غزل کی تخلیق اس سے آزاد نہ ہو سکے مگر اس کی ذات کو غزل کے معنی تک رسائی میں پیش نظر بھی نہ رکھا جائے۔غزل کے استعاروں کی تعمیم اسی تخلیقی عمل کی غماز ہے۔تناظر کی تبدیلی غزل کے شعر کو جس طرح نیا بنا دیتی ہے، اس سے سب بہ خوبی واقف ہیں۔جس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ غزل خود کو واقعہ سے نہیں بل کہ روح واقعہ سے جوڑتی ہے۔

اس بحث سے غزل کا مزاج اپنے تمام تر اوصاف کے ساتھ ظاہر ہو جاتا ہے۔غزل اپنے مزاج میں سمندر کو کوزے میں بند کرنے کا رویہ رکھتی ہے مگر اس طرح کہ قطرہ دریا کی نمائندگی کا فریضہ پوری طرح انجام دے سکے۔یہی رویہ اسے ایمائیت و اشارت کے استعمال پر مجبور کرتے ہوئے اس کے استعاروں میں تعمیم پیدا کر دیتا ہے۔ابہام اسی استعاراتی رویے کی دین ہے۔استعاراتی زبان غزل میں روحِ واقعہ کو گرفت میں لینے سے پیدا ہوتی ہے جو نئے تناظر میں نئے معانی پیدا کرنے پر قادر ہے۔غزل کے مزاج کی خوبی یہ ہے کہ وہ دوراہے پر یک سوئی کا مظاہرہ کرتی ہے اور ثنویت کو وحدت میں ڈھالتی ہے۔ غزل کے مختلف اشعار اس کی وسیع المشربی کو ظاہر کرتے ہیں۔ نتیجتاً وہ اس جمہوری دنیا کی نمائندہ صنف

نظر آتی ہے جو تہذیبوں کے تصادم کے برعکس ان کے اس اختلاط کو ظاہر کرتی ہے جہاں ہر تہذیب اپنی انفرادیت کو برقرار رکھنے کا پورا استحقاق رکھتے ہوئے ایک بڑے کل کا حصہ بھی بن سکتی ہے۔ غزل اپنے مزاج میں دیگر تمام اصناف سے زیادہ جمہوریت پسندانہ ہے اس لیے اس کے روشن مستقبل کے امکانات کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

***

حوالہ جات

(1) اردو لغت (تاریخی اصول پر)، جلد سیز دہم، اردو لغت بورڈ، کراچی، ۱۹۹۱ء، ص ٦٨٦۔

(2) فرہنگ آصفیہ، جلد سوم، چہارم، اردو سائنس بورڈ، لاہور، ۲۰۰٦ء، ص ۲۰٦۔

(3) وقار احمد رضوی، ڈاکٹر، تاریخ جدید اردو غزل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، کراچی، ۲۰۰۰ء، ص ۲۳۔

(4) طارق ہاشمی، اردو غزل۔ نئی تشکیل، زیرو پوائنٹ، راولپنڈی، ۲۰۰۸ء، ص ۲۵۔

(5) شمیم احمد سخن و شعری ہیئتیں، مطبع ندارد، سن ندارد، ص ۵۹۔

(6) وزیر آغا، ڈاکٹر، اردو شاعری کا مزاج، مکتبۂ عالیہ، لاہور، ۱۹۷۸ء، ص ۲۲۴۔

(7) ایضاً، ص ۱۵۔

(8) سعد اللہ کلیم، ڈاکٹر، اردو غزل کی تہذیبی و فکری بنیادیں، الوقار پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۵ء، ص ۲۸۔

(9) حمید احمد خان، پروفیسر، غزل کا مطالعہ، مشمولہ، تنقیدی مقالات، مرتبہ، میرزا ادیب، لاہور اکیڈیمی، لاہور، ۱۹٦۴ء، ص ۱۰۴۔

(10) ضیاء الحسن، ڈاکٹر، غزل اور غزل کی تنقید، مشمولہ، مخزن، لاہور، قائداعظم لائبریری کا ادبی مجلہ، جلد ۷، شمارہ ۷، ۲۰۰۷، ۱۳ء، ص ۴۲۔

(11) وزیر آغا، ڈاکٹر، معنی اور تناظر، نردبان، سرگودھا، ۱۹۹۸ء، ص ۲۵۲۔

(12) عابد علی عابد، سید، اصول انتقاد ادبیات، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹٦۰ء، ص ۲۷۰۔

(13) وزیر آغا، ڈاکٹر، معنی اور تناظر، ایضاً، ص ۲۴۹۔

(14) سلیم اختر، ڈاکٹر، غزل۔ تخلیقی عمل کا نفسیاتی مطالعہ، مشمولہ۔ فنون، جدید غزل نمبر (جلد اول)، جلد ۸۔ شمارہ ۳۔۴، انارکلی، لاہور، جنوری ۱۹٦۹ء، ص ۲۷۳۔